© rasailojaraid.com

کتاب و سنّت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

معجزاتِ قرآنی علومِ جدیدہ کی روشنی میں

یہ مقالہ اُن نکات کی تشریح و تفصیل پر مبنی ہے جو "لسان القرآن" میں معجزات و خوارق کے ضمن میں ذکر کیے گئے ہیں۔ اس میں سائنس، قوانینِ فطرت اور حیاتیات کے نظریات سے تعرض کیا گیا ہے۔ محمد حنیف ندوی

ہم پہلے ہی قدم پر معجزات کی متکلمانہ تعبیر کے بارے میں یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ یا اصطلاح غیر قرآنی ہے۔ لوہے کا حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں میں نرم ہو جانا، عصائے کلیمی کا اژدہا بن جانا، ابرص اور اندھوں کا شفایاب ہو جانا یا مُردوں کا دوبارہ زندہ ہو جانا، حشر و نشر کا وقوع، قوموں کا عروج و زوال اور ان کے اسباب و وجوہ پر روشنی ڈالنا، دلائل و براہین کا پیش کرنا اور نصوصِ قرآنی کی اعجاز فرمائیاں ایسے حقائق ہیں جن کو لفظ معجزہ اچھی طرح ادا نہیں کر پاتا۔ ان تمام مفاہیم کو جو اصطلاح اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے وہ ہے قرآن کی جامع اصطلاح "آیات"۔ "معجزات" کی اصطلاح غیر مکتفی ہونے کے علاوہ ایک غلط فہمی کو پیدا کرنے کی موجب بھی ہے، یعنی فیوضِ نبوت کی ایسی کارفرمائیوں کو سمجھنے سے عقل قاصر ہے یا ان پر انسانی قدرت کے مضمرات لاتعداد کا اطلاق ناممکن ہے، حالاں کہ ایسی محیر العقول کارفرمائیاں نہ صرف عقل و فہم کے آفاق و ابعاد کی وسعتوں پر دلالت کناں ہیں بلکہ قرینِ عقل و دانش بھی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ معجزات کی اصطلاح فیوضِ نبوت کی طرفہ طرازیوں کو بیان کرنے کا ایک ناقص اور منفی (NEGATIVE) پہلو ہے۔

معجزات کے بجائے ایک حد تک "خوارق" کی اصطلاح جامع نہ ہونے کے باوجود نسبتاً زیادہ موزوں اور صحیح ہے، یعنی انبیا کے دائرۂ قدرت کی کرشمہ سازیاں جو مالوف عقل یا معروف اسلوبِ طبیعت (MADE OF NATURE) سے جداگانہ نوعیت کی حامل ہیں۔ ہم آئندہ سطور میں معجزاتِ نبوت کو خوارقِ نبوت کے معنوں میں استعمال کریں گے۔ سردست جو "خارقہ" زیرِ بحث ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس دنیا میں کوئی شخص عزرا یا یرمیا سو سال تک موت کے مرحلوں سے گذرنے کے بعد دوبارہ زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی نشاط آفرینیوں سے بہرہ مند ہو سکتا ہے ؟

ان خوارق کے بارے میں دو باتیں خصوصیت سے سطح ذہن پر مرتسم رہنی چاہئیں :

۱۔ یہ خوارق اگرچہ انبیا کے ذریعے ظہور پذیر ہوتے ہیں تاہم ان کا براہ راست تعلق اذن الٰہی، قانون الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت وعلم کی ان پہنائیوں سے ہے جو لامحدود اور لامعدود ہیں۔

۲۔ انبیا کے ذریعہ ان کا ظہور اس بنا پر ہوا کہ یہ نفوس قدسیہ جس دور میں تشریف لائے، یہ دور اعجوبہ پرستی اور سحر طرازی کا دور تھا یعنی یہ عہد افسوں طلبی اور توہمات کا تاریک ترین دور تھا۔ آں حضرت نے جو اس دور کے خاتم کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے اور جنھوں نے دلائل اور عقل کے نئے در یچے وا کیے اور تجربہ و مشاہدہ کے جدید دور اور عہد کی داغ بیل ڈالی، ہمیشہ معجزہ طلبی اور اعجوبہ پرستی کے اس جذبے کی مخالفت کی، باوجود اس کے کہ خود آپ کی ذات گرامی سے متعدد خوارق کے اظہار کا احادیث و روایات میں ثبوت ملتا ہے۔ گویا اسلام نے خوارق و معجزات کے مقابلہ میں دلیل و برہان کی اہمیتوں کو زیادہ ترجیح دی۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے :

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ط الانفال ۴۲

تاکہ جسے برباد ہونا ہو وہ کھلے ہوئے نشان آئے پیچھے برباد ہو اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ بھی کھلے ہوئے نشان آئے پیچھے زندہ ہو۔

ارشاد باری ہے :

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ط (یوسف ۱۰۸)

آپ کہہ دیجیے کہ میرا طریق یہی ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، دلیل پر قائم ہوں، میں بھی اور میرے پیرو بھی۔

یعنی اسلام اور قرآنی تعلیمات کو راہ تقلید پر مبنی نہیں بلکہ بصیرت، دلیل اور برہان کی ضیا افروزیوں پر مشتمل ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے ایمان نہ صرف ایک عقیدہ ہے بلکہ اپنے آغوش میں عقل و دانش کی تابانیوں کو لیے ہوئے ہے۔ اسلام میں عقیدے کا تصور یہ ہے کہ یہ دلائل و براہین کے قافلوں کو آگے بڑھاتا ہے اور دانش و بینش کے عساکر اس کی تائید و نصرت کے لیے آگے بڑھتے اور اس کی سچائیوں کو پایہ ثبوت تک پہنچاتے ہیں۔

موت وحیات کے مسئلے کے دو پہلو ہیں، ایک کا تعلق شہادت و گواہی سے ہے کہ یہ خوارق وقوع پذیر ہوئے یا نہیں دوسرے پہلو کا تعلق مختلف سائنسی نظریات سے ہے کہ ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونے سا منے ہم ان کے امکان کو تسلیم بھی کر سکتے ہیں یا نہیں۔

آئیے بحث کے ان دونوں پہلوؤں پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈالیں۔

جہاں تک ان کے وقوع پذیر ہونے کا تعلق ہے، اس کی شہادت و گواہی خود قرآن حکیم نے دی ہے انبیائے گذشتہ اور جناب سعادت مآب آں حضرتؐ نے دی ہے، جن سے بڑھ کر کوئی سعادت شعار نہیں۔ اس ضمن میں صرف دو آیتیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ارشاد باری ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ○ (النساء : ۸۷)

اور کون اللہ سے بڑھ کر سچا ہے۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللّٰهُ (الانعام : ۱۹)

آپ کہیے شہادت سب سے بڑھ کر کس چیز کی ہے؟ کہہ دیجیے کہ اللہ کی گواہی۔

اور یہ کیوں؟ اس لیے کہ قرآن صرف رشد و ہدایت کے اصولوں پر مبنی کتاب نہیں، اس میں صرف عقائد، عبادات اور اخلاق و سیرت کی زلف و کاکل کو سجانے اور سنوارنے کے طریقے اور اسلوب ہی بتائے نہیں گئے، یہ ایک مستند تاریخی دستاویز بھی ہے جس میں اساطیر اور قصص سے متعلق انسانی دست اندازیوں کی تشریح بھی مذکور ہے، اس میں واقعات کی صحیح سمتوں کی نشاندہی کا تذکرہ بھی ہے، عمرانی نظریات عروج و زوال کی تشریح بھی کی گئی ہے، اور قصص و اساطیر کے پیچھے رُوح، اصل اور مجاز و استعارہ کے جو پیمانے کارفرما ہیں ان کو بھی نکھارا اور واضح کیا گیا ہے۔ اس بنا پر اس کی شہادت و گواہی صرف تاریخی حیثیت کی حامل نہیں، یہ ایک عقلی اور فکری شہادت بھی ہے۔ انبیا و رسل کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں نہ صرف صداقت شعار ہوتے ہیں بلکہ ان کی مکمل سچائی اور صداقت ہی وہ پیمانہ یا دلیل ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی صداقت اور سچائی کا دائرہ دنیوی زندگی سے آگے نکل کر وحی و تنزیل کے حقائق تک پھیلا ہوا ہے۔

اس کے بعد ہم سائنسی علوم و معارف سے متعلق چند نکات کی وضاحت کریں گے۔

سب سے پہلے ہم سائنسی نتائج کی اہمیت کے بارے میں کچھ کہیں گے۔ اس سلسلے کا پہلا سوال یہ ہے کہ سائنس کیا ہے؟ سائنس کے معنی یہ نہیں کہ ہمارے گرد و پیش پھیلی ہوئی کائنات اور ارض سے لے کر کہکشاؤں تک وسیع تریں حلقۂ وجود کسی نظام کے ساتھ وابستہ یا مربوط ہے، یا یہ یونہی بکھرا ہوا مظاہر قدرت پر مشتمل ایک تماشا ہے۔ سائنس کا یہ کہنا ہے کہ یہ سارا عالم ہست و بود علت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(CAUSE) اور معلول (EFFECT) کے تار و پود سے مربوط و وابستہ ایک نظام ہے۔ زمین، آسمان، کواکب و نجوم اور نباتات و حیوانات سب مظاہر اسی علت و معلول کی کارفرمائیوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہی وہ مفروضہ یا مقدمہ ہے جس کو تسلیم کر لینے سے اس نظام میں ایک طرح کا ربط و اتصال نظر آنے لگتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالم مادی کسی بخت و اتفاق کی کرشمہ سازی یا کسی خارجی روحانی و الوہی عنصر کے وجود کا رہین منت نہیں جیسا کہ اہل مذہب اور مابعد الطبیعاتی فلسفہ کے شارحین کہتے ہیں۔ علت و معلول کے اس رشتہ کو مان لینے سے بلاشبہ دو فائدے نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عالم اپنی گوناگونی کے باوجود ایک سلک میں منسلک ہو جاتا ہے اور دوسرے اس کی بدولت سائنس کے انکشافات اور خوارق و معجزات کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

لیکن اس کا کیا کیجیے کہ خود تجربیت (EMPIRICISM) کے بہت بڑے حامی ہیوم نے علت و معلول کے درمیان کسی منطقی لزوم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ علت و معلول کے آگے پیچھے آنے سے یہ ثابت نہیں ہو پاتا کہ اول و سابق اور لاحق و نتیجہ میں کوئی منطقی رشتہ پایا جاتا ہے۔ ہم اس رشتہ و تعلق کی اس نوعیت کو خود تجربے کی روشنی میں ثابت نہیں کر سکتے۔ سائنس کی ساری منطق استقرا (INDUCTION) پر مبنی ہے اور استقرائے سے علت و معلول کے درمیان جو لزوم فرض کیا جاتا ہے وہ ہمارے تجربات کی گرفت میں آنے والی شے نہیں۔ ہم اس منطق کے تتبع میں ہر سابق کو علت اور اس سے ملے ہوئے ہر لاحق کو معلول قرار دے لیتے ہیں۔ لیکن سابق و لاحق میں جو لزوم فرض کیا جاتا ہے وہ محض تجرید (ABSTRACTION) اور ظن اغلب پر مبنی ہے۔ جس میں استثنا کی ہمیشہ گنجائش کا امکان رہے گا۔ وہ مرغی جسے ہم وقت مقررہ پر روزانہ غذا یا دانا دنکا مہیا کرتے ہیں، یہ فرض کر لینے میں حق بجانب نہیں سمجھی جا سکتی کہ ایک روز ہم اسے ذبح کر کے اپنے کام و دہن کی تواضع کا اہتمام نہیں کریں گے۔

غزالی نے ہیوم سے بہت پہلے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ علت و معلول کا یہ رشتہ منطقی لزوم کا حامل نہیں۔ کسی انداز سے کبھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ علت کے بطن میں، وہ تمام نتائج پہلے سے پرورش پا رہے ہیں جن کا ظہور بعد میں ہوتا ہے اور ہم ان کو بر بنائے عادت یا غلبۂ ظن کے، علت و معلول قرار دے لیتے ہیں۔ جو بات امر واقعی کی حیثیت سے ثابت شدہ ہے وہ صرف اتنی سی ہے کہ کچھ چیزیں سوابق کی صف میں شمار ہوتی ہیں اور کچھ لواحق کے زمرہ میں، لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان میں کسی تجربی و منطقی لزوم کا احساس و تجربہ کی روشنی میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

گو غزالی اور ہیوم کی وجہ تشکیک میں بیّن فرق ہے۔ غزالی اس تشکیک سے معجزات و خوارق کے جواز و امکان کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اور ہیوم تجربیت کی اہمیت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ ہیوم کی اس تشکیک کو سائنسی تجربات میں سنگِ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ دونوں نابغۂ روزگار حضرات بہرحال تشکیک کے زبردست حامی اور عظیم علم بردار ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر اس تشکیک کو جو بیک وقت تجربی بھی ہے اور مابعد الطبیعیاتی بھی مان لیا جائے تو سائنس کی قطعیت (CERTAINTY) کا قصرِ بلند بام دھڑام سے زمین پر آ رہتا ہے جس کے بل پر ہم نے خوارقِ نبوت کا انکار کیا تھا۔

ہمیں علت و معلول کے اس نظام کے کچھ اور گوشوں کے بارے میں بھی غور کرنا ہے۔ ان میں نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ علت و معلول کے اس نظام سے وجود کے تمام دائروں کی تشریح نہیں ہو پاتی۔ مثال کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے حیات و زندگی کا اشکال حل نہیں ہو پاتا۔ کسی بھی مظہرِ حیات کا کیمیاوی تجزیہ کیجیے، آپ کو اس کے کسی جزو میں زندگی مچلتی ہوئی نظر نہیں آئے گی۔ اس کے جواب میں مارکسی نقطۂ نظر یہ ہے کہ مادہ کسی جامد و راکد شئے کا نام نہیں، یہ ایک متحرک حقیقت ہے جس کے تحرک و اتساع سے اس تمام کائنات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کو وہ اپنی اصطلاحوں میں یوں بیان کرتے ہیں کہ کمیت ایک تحرک و اتساع کے عمل سے خود بخود کیفیت میں بدل جاتی ہے اور اس طرح یہ تبدیلی کمیت کے فاصلوں کو طے کر کے کیفیتی تغیر (QUALITATIVE CHANGE) کے دائرہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کو سمجھانے کی غرض سے وہ اکثر اس مثال کو پیش کرتے ہیں کہ وہ انڈا جو بظاہر حیات و زندگی کا حامل نہیں ہوتا جب مرغی اس کو سیتی اور حرارت و تپش کی ایک متعین مقدار اس کو بہم پہنچاتی ہے تو اس انڈے سے ایک زندہ چوزہ برآمد ہو کر پرافشاں ہو جاتا ہے، اس بنا پر مادہ اور حیات و زندگی کی بوقلمونیوں میں کوئی تضاد باقی نہیں رہتا بلکہ مادہ ہی بعض مادی شرائط کے حصول کے بعد خود بخود زندگی کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔

اس طریق استدلال میں جو غلوطہ (FALLACY) پنہاں ہے وہ یہ ہے کہ انڈے کے عناصر ترکیبی میں کوئی کیمیائی و آلاتی ایسا عنصر نہیں پایا جاتا جو زندگی کو جنم دیتا ہے، بلکہ یہ زندگی انڈے کی ایسی ترکیب و ساخت یا نظم کا نتیجہ ہے جو زندگی کے بال و پر پیدا کرتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی مادی عنصر کی کارفرمائی سے شرائط مادی (MATERIAL CONDITION) اس کو پیدا کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا موجب نہیں بنتے۔ چنانچہ اس قدرتی انڈے کے بجائے اگر پلاسٹک کا بنا ہوا انڈا آپ مرغی کے پروں تلے رکھ دیں تو اس میں زندگی کی نشاط آفرینیاں ابھر نہیں پائیں گی۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہنا چاہیں گے کہ اس کی ترکیب و ساخت میں نہ صرف اس کے عناصر ترکیبی زندگی کا سبب یا علت نہیں ہیں بلکہ کسی بالاتر (TRANSCENDENT) حکیم و قدیر ہستی نے اس کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ اس سے انڈے میں زندگی انگڑائیاں لینا شروع کر دیتی ہے، لہٰذا مادے کا یہ تحرکی تصور بھی زندگی کے اشکال کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ مادے کے بارے میں یہ نظریہ بھی اب فرسودہ اور متروک ہو کر رہ گیا ہے، اور تو اور اس کے بجائے خود مادہ اپنی حیثیت و سطح سے گر کر برٹرینڈ رسل کی زبان میں محض مجموعہ احوال (EVENTS) ہو کر رہ گیا ہے۔

زندگی کی اسی کھکھیڑ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے برگساں نے قوی تر حیاتیاتی عنصر (VITAL FORCE) کی پناہ لی اور کہا کہ اصل میں یہ مادہ کا اختراع نہیں ہے جس نے زندگی کو جنم دیا بلکہ زندگی کی یہ زبردست قوت بجائے خود ایک تخلیقی عمل ہے اور تمام مظاہر حیات کو وجود کی سطح پر لانے کی تنہا موجب ہے۔ یہ نغمہ جو ہم بلبل ہزار کے حلقوم سے نکلتا اور مچلتا ہوا دیکھتے ہیں، اس کے حلقوم کی ترکیب و ساخت کا نتیجہ نہیں بلکہ زندگی نے جب چاہا کہ انسانی دنیا نغمگی و آہنگ کی شیرینیوں سے آگاہ ہو تو اس نے بلبل و ہزار کی چونچ اور حلقوم کو ایسے سانچے میں ڈھال دیا کہ اس سے صوت و آہنگ کی معجزہ طرازیاں ظاہر اور نمایاں ہوئیں۔

قوت حیات نے جب چاہا کہ انسان کھانے پینے، سونگھنے دیکھنے اور غذا کو ہضم کر کے اس کو اپنا جزو بنائے تو اس نے آنکھیں پیدا کیں، ناک کا نقشہ تیار کیا اور ایسے آلات ہضم کی آفرینش کی کہ جن کی مدد سے انسان اپنے حیاتیاتی تقاضوں کو پورا کر سکے۔

سوال یہ ہے کہ برگساں کی یہ زبردست قوت حیات خود کیا شے ہے؟ کیا یہ محض کھری مادیت کا ردعمل ہے یا کوئی سائنسی معروضہ ہے جس سے شعور و ادراک، فہم و بصیرت اور انداز حیات کے آفاق و ابعاد کی تشریح ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سے وہی جبریت (FATALISM) نہیں ابھرتی جو علت و معلول کے مخصوص نظریہ سے ابھرتی ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سائنسی عقیدہ ہونے کے بجائے ایک نیا مابعدالطبیعیاتی عقیدہ ہے۔ اگر ان اشکالات کا حل اس نئے مابعدالطبیعیاتی طریق سے ہی پیش کیا جانا تھا تو اس سے کہیں زیادہ معقول اور سادہ عقیدہ یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اس تمام کون و مکان کا ماخذ و مصدر وہ خلاق، وہ علیم و حکیم ہستی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے جس کی قدرت و حکمت کی تجلیات کے اظہار کا یہ نتیجہ ہے۔ اسی کی ذات سے وجود و ہستی اور حیات کی یہ کرنیں پھوٹی اور پھیلی ہیں۔ ان لوگوں کو یہ کون بتائے کہ بعض سادہ عقیدے اپنے آغوش میں نسبتاً کہیں زیادہ معروضی حقائق کو لیے ہوتے ہیں۔

جب انسان نے اپنے حقیقی خالق و رب سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تو پھر جھوٹے خداؤں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔ برگساں نے اس حقیقی سرچشمۂ حیات کو چھوڑ کر اس کے جھوٹے بدل کو ساری زندگی کا سرچشمہ قرار دے لیا۔ اس ضمن میں اس نے زمانے کی غلط تشریح کی، یہ دوسرا صنم ہے جس کی پوجا اور پرستش پر انسان کو مجبور کیا گیا۔ جس زمان کو وہ تخلیقی عنصر قرار دیتا ہے، وہ تو خود اللہ تعالیٰ کے تخلیقی مظاہر کا ایک پیمانہ ہے جس سے ہم کسی ظہور کو ماضی، حال یا مستقبل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس خطرے کا احساس برگساں کو کھٹکتا رہا جس کو رفع کرنے کے لیے اس نے زمانِ محض، یا دہر سے تعبیر کیا جو ایک ازلی و ابدی نہر کی طرح ہمیشہ بہتی رہتی ہے۔ لیکن یہ زمانِ مطلق ایک ذہنی تجریدیت (ABSTRACTION) کے سوا اور کیا ہے۔ اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں افلاطون نے زمانہ یا دہر کو یہ کہہ کر نکھار دیا کہ یہ ازلیت کے متحرک خدوخال کو واضح کرنے کا ایک اسلوب ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں زمانہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ (MOVING IMMAGE OF ETERNITY) ہے۔ یعنی زمانہ جس کو آپ ایک مستقل وجود اور حقیقت کی حیثیت سے جانتے اور مانتے ہیں، وہ بھی اسی محبوب ازلی کی صورت اور چہرہ مہرہ پہچاننے کا ایک ذریعہ ہے۔

ان مظاہر گوناگوں کو اگر ہم اسی ازلی خدائے مدبر و برتر کی صفاتِ علم و حکمت اور قدرت و اختیار کی تجلیات مان لیں تو وجود و ہستی کی دہلیز سے لے کر حیات اور اس کے ارتقائے فکر و دانش کے افق تک پھیلا ہوا ہر عقدہ آپ سے آپ وا ہو جاتا ہے۔ حل طلب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس ہستیٔ برتر کی صفات کیا ہیں اور اس کا اپنی مخلوق سے کیا رشتہ و تعلق ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی ذات، صفات و شئون کی ردائے مخملیں میں کچھ اس طرح مستور و محجوب ہے کہ منطقی دلائل کے سیاہ چشمے سے اس کو دیکھا نہیں جا سکتا لیکن ایسا کیوں ہے۔ کارلائل کے الفاظ میں "یہ اس لیے ہے کہ عقل مند اور زیرک انسان اس کے جمال جہاں آرا کی جھلکیوں کو دیکھ لے اور احمق اور گھٹل اذہان اس تک رسائی حاصل نہ کر پائیں۔

ارسطو نے جب اسے ایسی علت قرار دے لیا جو سلسلۂ تعلیل و تسبب کو ختم کر کے ایسی تخلیقی علت قرار پائے جو تمام تر محدود کیمیاوی و آلاتی علتوں کو ختم کر دے، اور ایسا سرچشمۂ حیات و وجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرار پائے جو عقل و بینش اور انسان کی تمام فکری و عملی الجھنوں کو حل کر دے، تو اس کے بعد یہ سوال بے معنی ہو جاتا ہے کہ خود اس علت کی علت کیا ہے کیونکہ (UNCAUSED CAUSE.) کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس آخری حقیقت کو پا لیا جس کی تلاش و جستجو میں انسان ہزاروں برس سے سرگرداں اور ششدر رہا۔ اس کے بعد یہ پوچھنا کہ خود اس علت کی علت کیا ہے، مہمل اور بے معنی بات ہی نہیں سراسر غیر منطقی بھی ہے۔ قانون کی اصطلاح میں یہ امر کافی ہے کہ کسی متنازعہ فیہ مسئلے میں آخری سند پیش کر دی جائے۔ اس آخری سند کی سند نہیں طلب کی جاتی۔ سیاست کی سطح پر ہم یوں بھی اس مفہوم کو ادا کر سکتے ہیں کہ جب ہم نے کسی پارلیمنٹ، کسی نظام حیات یا کسی سربراہ کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ جو چاہے فیصلہ کرے، ہمیں منظور ہے تو اس کے بعد یہ دریافت کرنا، منطق کی اصطلاح میں ناجائز ہوگا کہ اس نظام، اس پارلیمنٹ یا سربراہ کے اوپر اور کون اتھارٹی ہوگی مزید برآں قدیم یونانیوں کی اصطلاح میں، علت کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اصل اور وہ محرک اور تخلیقی سرچشمہ کیا ہے جس سے معلول، وجود کا پیراہن اختیار کرتا ہے۔ ان کی اصطلاح میں وہ تصور یا مثال (IDEA.) بھی ہو سکتا ہے اور مادہ بھی۔ یہاں عجیب قسم کا ایک تضاد پایا جاتا ہے، جو یہ ہے کہ ہم تصور و مثال یا مادے کو تو مظاہر فطرت کا منبع مان لیتے ہیں اور مطلق سوال نہیں کرتے کہ اس مثالیت یا مادیت کے پھیلاؤ اور اظہار کی علت کیا ہے۔ لیکن اگر خالق حقیقی کو ہم خالق حقیقی مانتے ہیں تو آپ یہ پوچھ لینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس خالق حقیقی کا خالق کون ہے؟

ہم منطق استقرائی اور اس پر مبنی سائنسی انکشافات کے منکر نہیں، اس لیے کہ منطق استقرائی کی بنیاد تو خود قرآن حکیم نے رکھی ہے۔ ہمیں جو کہنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس کی حتمیت اور تحکم کے ہم قائل نہیں، اور یہ کہ اس سے وجود و حیات کے تمام گوشوں پر روشنی نہیں پڑتی۔ مثلاً حیات سے قطع نظر، انسان کا تشخص جن صفات سے ابھرتا اور دمکتا ہے وہ اس کی عقلی و فکری صلاحیتیں ہیں، اس کے حدود و ابعاد ہیں، جن میں استدلال، تدبر اور حقائق کا براہ راست مشاہدہ بھی داخل ہے۔ اور تصور آرائی اور تخیل کی وہ لامحدود پروازیں بھی شامل ہیں، جو زمان و مکان کی قیود میں جکڑی ہوئی نہیں۔ یہ انسانی ذہن اور اس کی تخلیق و اختراع کی گوناگوں قوتیں، جو حسن و جمال کے نادر نمونوں اور پیمانوں کا تعین کرتی ہیں، جو تہذیب و تمدن کے نئے نئے صنم خانے تعمیر کرتی ہیں، کیا صرف مادہ یا علت و معلول کے ارتقائی نظام کی ایک لطیف شکل ہے۔ یا اس سے زیادہ کوئی فائق تر حقیقت (TRANSCENDENT.) ہے جو مادی قوانین اور قاعدوں سے ماورا، بالاتر اور قطعی بے نیاز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ یہ ذہن جسے ہیں دماغ کی کیمیائی ترکیب وساخت کا نتیجہ سمجھتا ہوں وہ چیز نہیں جسے انگریزی میں (BRAIN.) کہا جاتا ہے۔ میری مراد اس سے وہ شے ہے جس کا معروف ترجمہ (MIND.) ہے۔ یہ محدود اور سمٹے ہوئے مادے کی لطیف ترین صورت ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ مادے کی جدید تر تعریف ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ بندھے ٹکے پیچ باقطرت کے قوانین کا سراسر پابند اور تابع ہے، جب کہ ذہن انسانی کی رسائیاں اور اڑانیں آفاق و ابعاد کی وسیع تر فضاؤں کو گھیرے ہوئے ہیں۔

مادی نظریے سے تو "جبلت" ہی کی تشریح نہیں ہو سکتی کہ یہ کیوں کر پیدا ہوئی اور کیوں کر اس نے انجام تکمیل اور توارث و تناسل کی لاتعداد منزلیں طے کیں، چہ جائے کہ اس کی روشنی میں ذہن انسانی میں تمام تر مضمر قوتوں اور صلاحیتوں کو اس کے توسل سے جان سکیں اور ان کو کسی بندھے ٹکے نظام میں منسلک کر سکیں۔ جبلت (INSTINCT.) کی بات چلی ہے جو شعور کی ادنیٰ سطح کا نام ہے تو قرآن حکیم کے اس ارشاد پر غور کیجیے اور بتایئے کہ علم الحیات کے ماہرین اس سے زیادہ جامع اور حقیقت پر مبنی کوئی تعریف پیش کر سکتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۙ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ (النحل: ۶۸)

اور آپ کے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں القا کیا کہ تو گھر بنا لے پہاڑوں میں بھی اور درختوں میں بھی اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں بھی، پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوستی پھر، پھر اپنے پروردگار کے راستوں پر چل جو تیرے لیے آسان ہیں۔

یعنی جس کو آپ لوگ جبلی علم کہتے ہیں، وہ کسی زندہ نظام عضوی سے تعبیر نہیں بلکہ وہ وحی و القا کے قبیل کی ایک حقیقت ہے، جس کی عمدہ مثال شہد کی مکھی میں پائی جاتی ہے۔ اس میں شہد تیار کرنے کا رجحان، صلاحیت اور ایک نوع کے کیمیاوی اجزا کو ترتیب دینے کا عجیب و غریب نظام اور سلیقہ پایا جاتا ہے وہ اس کے جسمانی آرگانزم کا مرہون منت نہیں۔ جبلت کی تخلیق و تربیت قانون فطرت سے بالاتر ایک آئین فطرت سے تعلق رکھتی ہے جو وحی و القا سے عبارت ہے۔ یہ تو انسان اور حیوانات میں شعور مخفی کی ایک تجلی ہے، انسانی فکر و استدلال کا مرکز جسے ہم ذہن کہتے ہیں اس کے فتوحات کی سرحدیں تو از سمک تا بہ سماک وسعت پذیر ہیں، ان کو مادی ٹرمز یا شرائط کی روشنی میں سمجھنا کیوں کر ممکن ہے جو سراسر محدود اور زمان و مکان کی زندانی ہیں۔

دماغ کی یہ فتوحات کہ یہ اس عالم رنگ و بو کو ایک حد تک سمجھنا اور جانتا بوجھتا ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علوم و معارف کی رنگا رنگی اور تہذیب و تمدن کے بوقلموں اسرار و رموز سے اس کی گہری شناسائی ہے، ایک مسلّمہ امر ہے۔ لیکن یہ اس کے مظاہر کا ایک خارجی پہلو ہے۔ دماغ کی ایک باطنی سطح جسے ہم قلب و باطن کہتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ عمیق، پیچیدہ اور محیر العقول ہے۔ اس کے کرشمے اور جلوے بھی لامحدود ہیں اور ہماری چشم تصوف آشنا ماضی میں بھی صحابہ، تابعین اور اولیا و مشائخ کے تصرفاتِ روحانی کو دیکھ چکی ہے اور مستقبل کے بارے میں بھی ایسے کرشموں کے امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتی کہ وہ دور آنے والا ہے جب انسان بغیر کسی مواصلاتی سیارہ کی مدد کے اپنے گھر میں بیٹھا امریکہ اور ماسکو کے دھڑکنے والے دلوں کی آواز سُن سکے گا، دریاؤں میں جہازوں کی منت پذیری کے بغیر تیر سکے گا، ہواؤں میں اُڑ سکے گا۔ لیکن یہ جب ہوگا جب ہمارے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ عشق و تودد کے رشتے مضبوط ہوں گے۔ ہم ایسے ماورائی کرشموں کو کرامات سے تعبیر کرتے ہیں جو فیوضِ نبوت کے فہم و ادراک پر مبنی ہوتے ہیں۔ بلاشبہ کفار بھی ریاضت و مجاہدۂ باطنی سے بسا اوقات ایسا مقام حاصل کر لیتے ہیں جس کے بل پر وہ محیر العقول شعبدہ طرازیوں پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ ہماری اسلامی اصطلاح میں یہ استدراج کا مقام ہے، جو مقام کرامت سے بہت فروتر ہے۔ کیونکہ استدراج محض کرشمہ سازی ہے کردار اور سیرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے برعکس تعلق باللہ اور تعلق بالرسول سے چشم باطن کے جو دریچے وا ہوتے ہیں، اس کی وسعتیں اور پہنائیاں، دائرۂ استدراج سے کہیں آگے اور کہیں زیادہ نوعِ انسانی کے لیے مفید تر ہیں۔

پیرا سائیکالوجی (PARA-PSYCHOLOGY) ان اسرار و رموز کو جن کا تعلق ماورائی قوتوں سے ہے، پچھلے پچاس برس سے ٹٹولنے اور جاننے میں مصروف ہے۔ دیکھیے تجربہ و مشاہدہ کے یہ نتائج کہاں پہنچتے ہیں۔ بہرحال جو بات ہمیں کہنا ہے وہ یہ ہے کہ مادی اور کیمیاوی اور تکنیکی اسلوب و تدبر سے دماغ کی تمام تر صلاحیتوں، سطحوں اور گہرائیوں کو جاننا بہت مشکل ہے۔ شاید مستقبل میں جب سائنس اور اسلام شانہ بشانہ تحقیق و تفحص کے میدان میں اُتریں تو بات کچھ بنتی نظر آئے۔ ورنہ سائنس کے بس کا یہ روگ نہیں کہ یکہ و تنہا یقین کے ساتھ کوئی دعویٰ پیش کر سکے۔ حقیقت اور یقین کی منزلوں کو طے کرنے کے لیے کتاب اللہ اور ارشادِ نبوی سے استفادہ کرنا ہوگا۔

خوارق و معجزات کے خلاف آخری دلیل یہ ہے کہ ان کو ماننے سے قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لگے بندھے اصولوں کی مخالفت ہوتی ہے۔ آئیے ہم اصولِ فطرت پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ اس سلسلے کا پہلا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ یہ اصطلاح مبہم اور موضوعی (SUBJECTIVE.) ہے۔ ان قوانین کا اپنا کوئی مستقل بالذات وجود نہیں۔ یہ تو فقط ایک نوع کا انتزاع ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ کائنات یا اس عالم رنگ و بو نے اپنے ارتقا میں کن کن صورتوں کو اختیار کیا اس کی عادت، اس کی چال اور اسلوب نے کیا کیا روپ اختیار کیے اور کیا کیا رویے اپنائے۔ یہ دراصل حیات و بشریت کے درمیان استمرار کی جو صورت لاکھوں اور کروڑوں برس تک رہی، اس کی ایک تاریخ ہے، جس کی بہت سی کڑیاں ابھی علم الحیات اور طبیعیات کے ماہرین کو معلوم نہیں ہو سکیں۔ اس میں سائنسی نقص یہ ہے کہ جو کچھ مطلوب ہے وہ بہت کم ہے اور اقل قلیل۔ جو معلوم نہیں ہے، اس کا کوئی عدد و حساب نہیں۔ نیچر یا فطرت کے استمرار کی تاریخ نہ کہیں مدون ہے اور نہ علم و ادراک کے دائرہ میں قطعی اور یقینی ہی مانی جاتی ہے۔ علم الحیات اور طبیعیات کے ماہرین نے معلومات کا جو ذخیرہ (DATA.) پیش کیا، اس سے استمرار کا کوئی متعین اور لگا بندھا اصول فکر و نظر کی سطح پر نہیں ابھرتا۔ اور جو نتائج انھوں نے اس ذخیرۂ معلومات سے اخذ کیے وہ مسلمہ ذخیرۂ معلومات سے نہ صرف ثابت شدہ نہیں بلکہ الٹا اس ذخیرۂ معلومات سے کہیں زیادہ اس میں خیال آفرینی ہے۔ ہم اس طرز استدلال کو (EXTRAPOLATION) کی اصطلاح سے تعبیر کریں گے۔ یعنی مقدار معلومات سے کہیں زیادہ اہم نتائج کا استخراج۔ سمجھنے کے لیے فطرت کی اس عادت و خو، اسلوب ارتقا اور چال پر غور کیجیے جسے آپ استمرار کہتے ہیں اور قانونِ فطرت کی مرعوب کن اصطلاح میں لپیٹ کر بیان کرتے ہیں۔ اس سارے قصے میں دیکھنے کی یہ چیز ہے کہ آیا فطرت کا یہ انداز و اسلوب ہمیشہ یکساں ایک ہی نہج پر قائم رہا اور تغیر و تبدل کے بغیر ایک ہی روش پر گامزن رہا یا یہ استمرار عادت خود بھی مختلف زمان میں بدلتا اور ٹوٹتا پھوٹتا رہا یہ چمنستان عالم جو آج سجا سجایا اور ایک خاص نظم و ترتیب کی سنہری سلک میں منسلک نظر آتا ہے ہمیشہ تو ایسا نہ تھا۔ ایک دور میں یہاں ہو کا عالم طاری تھا اور پوری کائنات پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پھر کروڑوں برسوں کے بعد نجوم و کواکب نے اپنے اپنے مرکز و محور میں حرکت شروع کی۔ پھر خدا جانے کس طرح اور کیوں کر اور کتنے ملین برسوں کے بعد فطرت نے ایک نئی کروٹ لی اور یہ معمورۂ ارض ظہور پذیر ہوا۔ لیکن اس کے بعد بھی یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نہ پہاڑوں کی بلندیاں بولتی تھیں اور نہ لق و دق صحرا، زندگی کی ادنیٰ رمق سے آشنا تھے۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استمرار پر بھی لاکھوں اور کروڑوں برس گزر گئے۔ اب فطرت کی رگِ مردہ میں جان آئی اور اس معمورۂ ارض پر کچھ کچھ روئیدگی کے آثار نمودار ہوئے۔ اس طویل عرصے میں بھی جس کا پھیلاؤ بے عدد شمار برسوں کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے، اور کیا کچھ ہوا اور اس عالم رنگ و بو پر کیا بیتی، اس کا سوائے خدائے بزرگ و علیم کے اور کسی کو علم نہیں۔ پھر اس کے بعد نباتی حیات نے ترقی کر کے سچ مچ جیتی جاگتی صورتوں کی تشکیل کی۔ حیوانات پیدا ہوئے، گوناگوں اور بے شمار۔ ان میں کی بھی ہزاروں صورتیں حوادث کی نذر ہو گئیں اور ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی رو سے صرف وہی صورتیں باقی رہیں، جن میں بقا کی صلاحیتیں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں یعنی بقائے اصلح۔ ہم اس پیرایۂ بیان سے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے صرف یہی کہیں گے کہ صرف وہی صورتیں زندہ رہیں جن کا زندہ رکھنا عنداللہ اس کائناتِ ہست و وجود کے لیے ضروری تھا۔ یعنی یہاں جو اصول درحقیقت کارفرما تھا وہ بقائے اصلح کا نہیں تھا، تخلیقِ اصلح کا تھا۔

عالمِ حیوانی کے ظہور کے بعد چرخ نیلی فام نے بالآخر ہزاروں اور لاکھوں گردشوں کے نتیجے میں اس معمورۂ ارض پر جس وجود کو اُبھارا وہ حضرت انسان کا وجود تھا، جس نے خلافتِ الٰہیہ کی مسند سنبھالی اور خلعتِ خلافتِ ارضی اپنے جسم پر سجائے وہ اس دلبستانِ تہذیب و تمدن کی زلف و کاکل کو سنوارنے اور چمکانے میں مصروف ہو گیا۔ یہ ہے داستان مختصر طور پر اصولِ فطرت کی کرشمہ سازیوں اور خوارق و معجزات کی، کہ جن کے دھارے ہزار رکاوٹوں کے باوجود ایک خاص سمت میں بہتے رہے۔ اور آخر آخر میں وہ حاصلِ کائنات، وہ عالم کا دولھا اور فطرت کا چہیتا بیٹا ہویدا ہوا جس نے نہ صرف اپنے آئینۂ صفات میں ذات خداوندی کی جلوہ طرازیوں کی جھلکیاں دیکھیں، بلکہ اسی آئینے میں خود اس کائنات نے اپنی عظمت و جمال کی رعنائیوں کو دیکھا۔ انسان کے بغیر یہ عالم یکسر گونگا اور بہرہ تھا۔ یعنی یہ پر شکوہ پہاڑ، یہ لق و دق صحرا، یہ ندیوں اور دریاؤں کی روانی، اشجار اور روئیدگی کی طراوت و خوش نمائی اور پھولوں کی شمیم آرائیاں، سب خاموش اور چُپ تھیں۔ انسان آیا تو اس نے ان سب میں گویا جان ڈال دی۔ اب یہ سب بولنے لگے اور اپنی اپنی عظمت و جمال کے گیت گانے لگے۔

کائنات کے اس ارتقا کو جس میں بظاہر متعدد خوارق، دراڑیں اور رکاوٹیں پائی جاتی ہیں ڈارون نہیں سمجھ سکا اور سائنسی سطح پر اس کو سمجھنا کسی طرح ممکن بھی نہیں ہم اس بحث کو سپنسر کے ایک نہایت خوبصورت جملے پر ختم کرتے ہیں کہ قوانینِ فطرت کے ربط و ارتقا اور مظاہرِ فطرت کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناقابلِ تشریح گوناگونی کو اس کے بغیر عقل وفہم کے دائرے میں لانا ممکن نہیں کہ جب تک ہم ایک ازلی قوت کو نہ مان لیں جس کی سکیم اور تدبیر میں یہ بات داخل ہو کہ وہ کائنات کی کشتی کو ایک مقصد کے تحت چلائے اور آسودۂ ساحل کرے۔

لیکن ٹھہریے اس بحث کی اختتام پذیری سے پہلے ہمارے حکیم و فلسفی شاعر غالبؔ کا یہ شعر سنتے جائیے سے

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یعنی حیات و زلیست کی گتھی کو سلجھانے کے لیے جہاں ایمان باللہ ضروری ہے وہاں اس حقیقت پر بھی ایمان لانا ہوگا کہ دنیا جو بہرحال فانی عارضی اور زوال پذیر ہے۔ یہ تمنا کا صرف ایک قدم ہے جو اٹھا ہے، دوسرے قدم کا تصور کیے بغیر جسے ابھی اٹھنا ہے، خود یہ دنیا اپنی تمام تر جاذبیتوں اور رعنائیوں کے باوجود ناقابلِ فہم ہو جاتی ہے اور ہر طرح کی غرض و غایت اور مقصدیت سے تہی ماننا پڑتی ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا وجود نہیں اور ایک کامل اور مزید ارتقا پذیر دنیا کا وجود نہیں تو پھر یہ تمام تر کائنات مہمل، بے مقصد اور انسانی نقطۂ نظر سے قطعی ناشائستۂ التفات بن کر رہ جاتی ہے، پھر یہاں کوئی رہے اور جیے تو کیوں؟ کس لیے اور کس کی خاطر —؟

اس کائنات کے ارتقا میں آپ نے ان خوارق پہ غور کر لیا جن کے بل پر یہ دنیا بنی، سنوری اور آگے بڑھی۔ انسان ہی کی تخلیق و آفرینش کے سلسلے میں اس نکتے کی نشان دہی بھی ضروری ہے کہ وہ جوہرِ انسانی جو لاکھوں اور کروڑوں برس سے شکمِ کائنات میں پلتا اور بڑھتا رہا بالآخر آدم و حوّا کی تخلیق کے بعد صرف نو ماہ کی مختصر مدت میں اس قابل ہو گیا کہ ان تمام ارتقائی منزلوں کو طے کر کے تولد پذیر ہو اور جیتے جاگتے اور حقیقی انسانی روپ اور انسانی صفات سے متصف ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم یہ کہیں گے کہ بات دراصل یہاں سے چلی تھی کہ عزرا نبی یا یرمیاہ نبی نے جب یہ دیکھا کہ بخت نصر نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے اور بھرے پُرے شہر پہ ہو اور ویرانی کا عالم طاری ہے تو انھوں نے ازراہ یاس یہ کہا کہ اس شہر کی رونق دوبارہ کیوں کر لوٹ آئے گی اور یہ مردہ بستی کب اور کیوں کر پھر سے زندگی کی گہما گہمیوں سے ہمکنار ہوگی۔ تو اللہ تعالیٰ نے سو برس تک انھیں موت کی نیند سلائے رکھا اور اس کے بعد پھر انھیں زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عطا کر کے بنا دیا کریں۔ اس واردات سے ان کی چشم بصیرت وا ہوئی اور ان کی یاس و ناامیدی، اللہ تعالے کی قدرت کاملہ پہ یقین و اذعانِ محکم کی صورت میں بدل گئی۔

ہو سکتا ہے، یہ موت درحقیقت موت نہ ہو بلکہ ایک نوع کی تنویمی کیفیت ہو۔ اور موت بھی ہو جب بھی اس میں استحالہ کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ خالص حیاتیاتی نقطۂ نظر سے خشک اور دھوپ سے تپتے ہوئے صحراؤں میں ایسے حشرات الارض کا پنپنا پھلنا ہے جو بارش یا سیلاب کی تھوڑی سی نمی سے زندگی کی انگڑائیاں لینے لگتے ہیں اور دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ جب ویران کھیت بارش کے چند قطروں سے لہلہا اٹھتے ہیں، مردہ قومیں زندگی اور تہذیب و تمدن کی اقدار اعلیٰ سے دوبارہ بہرہ مند ہو سکتی ہیں، فرسودہ نظریے سائنسی روپ دھار لینے پر قدرت رکھتے ہیں، تو یہ کیوں ناممکن ہے کہ ایک مردہ شخص زندہ نہ ہو سکے۔ اور خصوصاً جب اس کی موت و زندگی کے تجربے سے تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ کی ذات کاملہ اور اس کے علم وسیع تر کا ہو تو اس صورت میں استعجاب و استبعاد کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے ــــ اس سلسلے میں سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ ان پیچیدہ معاملات و واردات کو سمجھنے کے لیے باہر کی روشنی زیادہ ممد و معاون ثابت نہیں ہوتی۔ اگر وجدان روشن ہو، ایمان کی تابانیوں سے قلب و ضمیر کی قندیلیں مستنیر ہوں اور انسان کے دل میں یقین و اذعان کے دیے دمک رہے ہوں تو عقل اور سائنس کے یہ پیدا کردہ فاصلے ایک جست میں طے ہو جاتے ہیں، اور اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو پھر ہر قدم پر تشکیک و لغزش کے گوناگوں اندیشے اور خطرات ہائے بے جا، راستے کا روڑا ثابت ہوتے ہیں۔

© rasailojaraid.com